ہے۔ لیکن قطرہ متعیّن ہو کر ایک طرح عارضی طور پر ساحل بن جاتا ہے۔ نہ ذرّہ اپنی منزل میں ٹھہر کر جامد ہونا چاہتا ہے اور نہ قطرہ ساحل بن کر آسودگی حاصل کر سکتا ہے۔ ذرّہ ہو یا قطرہ سب میں حرکت دائمی ہے۔ نہ ذرہ جامد ہے اور نہ قطرہ، اپنے تعیّن اور تشخص میں ساحل آسودہ بن کر ٹھہر سکتا ہے۔ یہ کہ تمام ذرے خدا کی طرف رواں دواں ہیں۔ اس مضمون کا غالبؔ کا ایک شعر ہم پہلے درج کر چکے ہیں ؎

اے تو کہ ہیچ ذرہ را جز بر تو روئے نیست
در طلبت تواں گرفت بادیہ را بہ رہبری

طریقِ وفا کی منزلیں طے کرتے ہوئے بقول اقبالؔ ؎

ہر شے مسافر، ہر چیز راہی ۔۔۔ کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی

غرقہ بموجہ تاب خورد، تشنہ ز دجلہ آب خورد
زحمتِ ہیچ یک نداد، راحتِ ہیچ یک نخواست

غرق ہونے والے نے موجوں کے تلاطم میں پیچ و تاب کھایا۔ اور دوسری طرف ایک پیاسا دریا کے کنارے آیا اور اس نے پانی سے پیاس بجھائی۔ آئینِ فطرت کے کے متعلق اگر نظر اپنی ذات اور منفعت تک محدود و محصور کر لی جائے تو موجوں میں غرق ہونے والا شاکی ہو گا کہ خدا یا اس کی فطرت نے خاص طور پر اسے زحمت دی اور دریا سے پیاس بجھانے والا یہ خیال کرے گا کہ خدا نے بالخصوص اس پر عنایت کی۔ غالبؔ کہتا ہے کہ افراد کے منافع اور ضرر سے خدا کے آئین کا تصوّر قائم کرنا غلط ہے۔ فطرت بھی قوانین پر مشتمل ہے۔ خاص خاص افراد کو نفع یا نقصان پہنچانا اس کا مقصود نہیں۔ فطرت کے اعمال میں کسی کو زحمت ہوتی ہے اور کسی کو رحمت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن فطرت افراد کے ساتھ فرداً فرداً کوئی

سلوک بالارادہ نہیں کر رہی۔ یہ حقیقت جان لینے سے ایک وسیع اور بلند زاویۂ نگاہ پیدا ہوتا ہے۔ کچھ اسی قسم کا مضمون ہے جو سحابی نے اس رباعی میں باندھا ہے ؎

عالم بخروشِ لا اِلٰہَ اِلّا ھوست ۔۔۔ غافل بگماں کہ دشمن است او یا دوست
دریا بوجودِ خویش موجے دارد ۔۔۔ خس پندارد کہ ایں کشاکش با اوست

جاہ ز علم بے خبر علم ز جاہ بے نیاز
ہم محک تو زر ندید ہم زر من محک نخواست

دنیا میں مال و دولت اور جاہ و اقتدار والے اکثر ایسے ہی ہوتے ہیں جنھیں علم کی قدر و قیمت سے کچھ آگاہی نہیں۔ اور حقیقی عالم وہ ہوتا ہے جو دولتِ علم رکھتے ہوئے جاہ سے بے نیاز ہوتا ہے۔ وہ اپنے علمی شغل کو دنیا طلبی پر قربان نہیں کر سکتا۔ اہلِ جاہ کو مخاطب کر کے غالبؔ کہتا ہے کہ تیرے معیار پر ہم نہیں آتے۔ تیرے پاس انسانوں کی قدر و منزلت کو جانچنے کی جو کسوٹی ہے اس کسوٹی پر دولتِ علم نہیں پرکھی جا سکتی۔ اور میرے پاس جو زرِ علم ہے وہ اس کا خواہشمند ہی نہیں کہ تو اسے اپنی کسوٹی پر پرکھے۔ بس نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ تم ہم سے بے خبر اور ہم تم سے بے نیاز۔ ایک عالم سے دریافت کیا گیا، یہ کیا بات ہے کہ اہلِ علم تو دولت والوں کے پاس حاضر ہوتے ہیں اور دولت والے اہلِ علم کے پاس نہیں آتے۔ اس نے جواب دیا کہ عالم ضروریاتِ زندگی کو رفع کرنے کے لیے مال کی قدر بھی پہچانتا ہے۔ بطور مقصد نہیں تو بطور ذریعہ ہی سہی۔ اور خود علم کی دولت سے بھی آگاہ ہے۔ اس لیے وہ دولت والوں کی طرف حسبِ ضرورت رجوع کرتا ہے۔ لیکن دولت والا مال کی قیمت تو خوب جانتا ہے۔ علم کی قیمت اس کے نزدیک کچھ نہیں، اس لیے وہ عالم کے کاشانے میں نہیں آتا۔

بحث وجدل بجائے ماں، میکدہ جوئے کاندراں
کس نفس از جمل نہ زد کس سخن از فدک نہ خواست

شیعہ اور سنّی کی اختلافی بحثوں میں سے ایک جنگِ جمل کا قضیہ ہے اور دوسرے باغ فدک کی وراثت کا جھگڑا۔ دین کی حقیقت سے ان چیزوں کا کوئی واسطہ نہیں۔ جنگِ جمل میں سیدنا حضرت علیؓ اور سیدہ حضرت عائشہؓ متخاصم فریق بن گئے اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی گردنیں کاٹیں۔ باغِ فدک حضرت فاطمۃ الزہراؓ نے وصالِ رسولؐ کے بعد بطور ورثہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے طلب کیا۔ وہ یہ سمجھتی تھیں کہ یہ باغ رسول اکرمؐ سے انھیں ورثے میں پہنچتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ باغ ان کے والد ماجد کی ملکیت میں آگیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کی یہ رائے نہ تھی۔ وہ فرماتے تھے ہم نے خاتم النبیینؐ سے سنا ہے کہ نبی کسی چیز کا وارث نہیں ہوتا۔ اور نہ اس سے کسی کو ورثہ ہی پہنچتا ہے۔ وہ حسبِ ضرورت زمین ہو یا باغ یا مکان اسے اپنی زندگی میں استعمال کرتا ہے۔ لیکن ملکیت نبوت کے منصب کے منافی ہے۔ ویسے صحابہ کرامؓ اور خصوصاً حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسا ایثار پیشہ شخص نبیؐ کی بیٹی پر جان چھڑکنے کو تیار ہوجاتا لیکن یہ اصول کی بات تھی اس لیئے وہ ورثے کا مطالبہ درست نہ سمجھتے تھے۔ آج تک شیعہ حضرات حضرت عائشہ صدیقہؓ کو جنگِ جمل کی وجہ سے بُرا کہتے اور باغ فدک کے جھگڑے کی وجہ سے خلیفۂ اول کو غیر عادل سمجھتے ہیں۔ ایک خاص قسم کے تشیع کا میلان غالبؔ میں بھی تھا لیکن فرقوں کے یہ مشاجرات انسان کو دین کی حقیقت سے دور لے جاتے ہیں۔ غالبؔ کہتا ہے کہ صہبائے حقیقت سے سرشار ہونا چاہتا ہے تو ان اختلافات سے قطع نظر کرلے۔ روحانیت کے میکدے میں یہ جھگڑے نہیں ہوتے ؎

سرِّ حق کے بر تو گردد منجلی اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ

در نوردِ گفتگو از آگہی وا ماندہ ایم
پیچ و تابِ رہ نشانِ دوریِ سرمنزل است

زندگی کے عام معاملات میں گفتگو اور مبادلۂ خیال سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان صورتِ حال سے آگاہ ہو جائے۔ لیکن بحث وجدل اگر جائز حدود سے متجاوز ہو جائے اور باتوں میں پیچ پر پیچ پڑتا جائے تو معاملہ سلجھنے کے بجائے اور اُلجھتا جاتا ہے۔ خصوصاً عقلی بحثیں اور عقائد کی آویزشیں انسان کو حقیقت سے بہت دور لے جاتی ہیں — "رہِ عقل جز پیچ در پیچ نیست"۔ زندگی کے گہرے وجدانات استدلال کے رہینِ منت نہیں ہوتے۔ عارفوں کی خاموشی ان کی گویائی سے زیادہ موثر ہوتی ہے۔ اس شعر میں غالبؔ زندگی کے اس وجدان کا ذکر کر رہا ہے جس کی ترجمانی زبان نہیں کر سکتی۔ اس کے متعلق کوئی شخص جتنی گفتگو کرے گا اتنا ہی وہ شعورِ ذات سے بے بہرہ ہوتا جائے گا۔ استدلال میں جتنے پیچ و خم بڑھتے جائیں گے صراطِ مستقیم گم ہوتی جائے گی۔ راستوں کے پیچ راہرو کو گمراہ کر کے منزل سے اور دور کر دیں گے۔

از جلوہ ہنگامہ شکیبا نتواں شد
لب تشنۂ دیدارِ ترا خُلد سراب است

یہ حقیقت رس عُرفا کا مسلّمہ عقیدہ ہے کہ حور و قصور کی جنّت عاشقِ ربانی کا مقصود نہیں ہوتی۔ حقیقت ازلی لازمانی اور لامکانی ہے۔ اس میں اجسام اور حواس اور لذتِ جسمانی کو کوئی دخل نہیں۔ تجلّیِ ذات کے مقابلے میں جنّتِ نعیم بھی سراب و سیمیا کی سی ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ جنّت کا ہنگامہ و لکش بھی جلوۂ الٰہی کے طالبوں کو شکیبا اور مطمئن نہیں کر سکتا۔ ہر صاحبِ دل صوفی نے اس عقیدے کی تائید کی ہے۔

SALEEM LIBRARY
I/S Sher anwala Gate,
Line Subhan Kh... Lahore.

حق راز خلق جو کہ نو آموز دیدہ را
آئینہ خانہ مکتبِ توحید بودہ است

خدا کو براہِ راست بلا واسطہ دیکھنا ممکن نہیں۔ جو کوئی توحید کا سبق پڑھنا چاہے اس کے لیے لازم ہے کہ خلق پر غور و خوض سے خالق کو پہچانے۔ دنیا حقائق کے عکسوں اور تصویروں کا آئینہ خانہ ہے۔ بچوں کو پہلے تصویروں ہی کے ذریعے سے تعلیم دی جاتی ہے۔ مکتبِ توحید میں بھی یہی طریقہ درست ہے کہ تصویروں کے جمال اور کمال سے مصور کو اور خلقت کے ذریعے سے خالق کو پہچانے۔ توحید آموزی کا یہ راستہ بتایا ہے۔

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

میرے سینے میں جو اسرار و رموز ہیں وہ برسرِ منبر وعظ میں کہنے کی باتیں نہیں۔ اگر اعلان کرنا شروع کر دوں تو لوگ مجھے سولی پر چڑھا دیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سولی پر لٹکے ہوئے کہہ ڈالوں۔ وعظ کی محفل میں عام طور پر ایک ہی عقیدے کے سامعین ہوتے ہیں۔ نہ واعظ میں شاہراہِ عام سے ہٹ کر کچھ سوچنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ سننے والوں میں نئے افکار کو جذب کرنے کی صلاحیت۔ اسی لیے نہ عارفوں کو واعظ کے وعظ میں سے کچھ ملتا ہے، اور نہ حکمت پسندوں کی دیدہ افروزی ہوتی ہے۔ ہاں عوام کو ترغیب دلانے یا ڈرانے کا مسالا بہت ہوتا ہے۔ حقائق کا کوئی متجسس وعظ سننے نہیں جاتا۔ زمانۂ قدیم میں علی گڑھ میں دینیات کے ایک پروفیسر جمعہ کے روز مسجد میں وعظ بھی فرماتے تھے۔ وہ خطابت میں بیل کھسار رکھتے تھے۔ ہر قسم کے مضامین، پند و نصائح، اشعار، افسانے سیلابِ بیان میں بہتے چلے جاتے تھے۔ سننے والے کچھ محظوظ بھی ہوتے تھے، اور کچھ اچھی باتیں بھی ان کے کانوں میں پڑتی تھیں۔ ایک روز کسی طالب علم نے باادب ان سے کہا

کہ مولانا آپ کا وعظ تو بڑا دلچسپ ہوتا ہے لیکن کبھی یہ پتا نہیں چلتا کہ اس کا موضوع اور مضمون کیا ہے؛ بہت برہم ہو کر بولے کہ نالائق موضوع ڈھونڈتا ہے، وعظ نہ ہوا لیکچر ہو گیا۔

صوفیہ اور حکما کے عقائد اور ان کا طرزِ بیان عامۃ الناس اور علمائے ظاہر کے اندازِ فکر سے مختلف ہوتا ہے۔ حقائق وہ جس طرح سمجھتے ہیں اگر برسرِ عام بیان کرنے لگیں تو لوگ انھیں کافر اور مرتد سمجھ کر درپے آزار ہو جائیں۔

سرِ نہان است اندر زیر و بم | فاش اگر گویم جہاں برہم زنم

اس لیے انبیا کو حکم ہوتا ہے کہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق باتیں کیا کریں۔ ورنہ وہ ہدایت کے بجائے گمراہی میں پڑ جائیں گے کلموا الناس علی قدرِ عقولہم

کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ ما را
مومن نبود غالبؔ و کافر نتواں گفت

لوگوں نے کافر اور مومن کی کوئی موٹی سی تقسیم بنا رکھی ہے۔ اس ناقابلِ اعتبار کسوٹی پر پرکھ کر کسی کو مومن کہہ دیتے ہیں اور کسی کو کافر بنا دیتے ہیں۔ علما میں باہم بھی تکفیر کا بازار گرم رہتا ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ عام عقائد کے لحاظ سے مجھ ایسے شخص کو نہ مومن کہہ سکتے ہیں اور نہ کافر۔ ایمان اور کفر کا حال خدا ہی جانتا ہے ؎

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا | اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں اقبالؔ

در قالبِ ملا اثرِ سِش پردہ کشا شد
خاکے کہ قضا در تنِ گوسالہ فرو ریخت

حضرت موسیٰ علیہ السلام کچھ روز کے لیے بنی اسرائیل کو اپنے بھائی ہارونؑ کے سپرد کر کے خلوت و مراقبہ کے لیے حصولِ وحی کے انتظار میں پہاڑوں پر چلے گئے۔

بنی اسرائیل بت پرستی کے عادی ہو چکے تھے۔ زبردست ہادی کی غیر حاضری میں اپنی قبیح عادت پہ عود کر آئے۔ زیورات جمع کر کے بچھڑے کا ایک بُت بنایا۔ اور اس میں کچھ ایسی عناعی کی کہ کہیں ادھر ادھر ہلانے دبانے پر اس میں سے بچھڑے کی سی آواز نکلتی تھی۔ بے جان کالبد میں یہ آواز کہاں سے نکلتی تھی؟ اس کے متعلق اسرائیلیات کے افسانوں سے لے کر عجیب عجیب قصے مسلمانوں میں بھی رائج ہو گئے۔ اور بعض تفسیروں میں بھی انھوں نے دخل پایا کہ یہ اعجاز نما مٹی جو اس گوسالے میں داخل ہو کر اسے بلوانے لگی وہ کہاں سے آئی۔ غالبؔ کہتا ہے کہ ہمارا ملّا بھی اسی قسم کا گوسالہ ہے۔ اس میں کسی قسم کی اپنی روح نہیں۔ لیکن کسی خاک کا اعجاز ہے کہ یہ گوسالہ بھی آواز نکالتا ہے۔ بیچارے ملّا پہ پھبتی کسنا ہمارے شعرا نے اپنا شیوہ بنا لیا۔ وہ بیچارہ اپنی بساط کے مطابق دین کو سمجھتا اور سمجھاتا ہے۔ عوام میں سے اُبھرتا ہے اور عوام کی سطح کے قریب قریب رہتا ہے۔ بہرحال رندِ خراباتی سے تو عموماً بہتر ہی ہوتا ہے۔ جب قوم کی ذہنی سطح بلند ہو جائے گی تو ملّا بھی زیادہ عالم اور زیادہ معزز ہو جائیں گے۔

کہنہ نخلِ تازہ از صرصرِ زپا افتادہ ام
خاکم ار کاوی ہنوزم ریشہ در گلزارہست

حوادثِ زمانہ سے کس کو پوری طرح گریز حاصل ہو سکتی ہے۔ جہاں زندگی ہے وہاں آفات کا سامنا بھی ہے۔ لیکن اگر انسان کے اندر زندگی کے چشمے خشک نہیں ہو گئے تو ہر حادثے کے بعد وہ پھر اپنا نخلِ حیات بلند کر کے اس میں سے برگ و بار نکال سکتا ہے۔ غالبؔ کے کلام میں اور اس کی زندگی میں حوادث کی کثرت نظر آتی ہے۔ لیکن وہ کہیں شکستگی خستگی اور یاس کی تعلیم نہیں دیتا اور نہ قنوط کو طبیعت پر طاری ہونے دیتا ہے۔ پرانے درخت جو ابھی ترو تازہ اور ثمر آور ہیں بعض اوقات آندھیوں سے گر جاتے ہیں لیکن ان کی جڑوں

اور تنوں میں زندہ ریشہ ہوتا ہے جس سے تازہ شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ کہتا ہے کہ میں بھی اسی قسم کا درخت ہوں۔ باطنی زندگی اور حیات آفرینی سے مایوس نہیں۔

رموزِ دیں نشناسم درست و معذورم
نہادِ من عجمی و طریقِ من عربی است

غالبؔ کے دینی عقائد کی بحث میں ہم اس شعر کا حوالہ دے چکے ہیں۔ لیکن یہ شعر دین کا ایک اہم مسئلہ زیرِ بحث لاتا ہے۔ لہٰذا اس کی کچھ مزید تشریح کی ضرورت ہے۔ دینِ اسلام نے حجاز کی ارضِ مقدس میں سب سے پہلے عربوں کو مخاطب کیا۔ قرآن کریم بھی عربی مبین میں نازل ہُوا۔ قرآن عربوں کو مخاطب کرتے ہوئے خود کہتا ہے۔ یہ اللہ کا فضل تم پر اس لیے ہُوا کہ تم اپنی زبان میں عمدگی سے رموزِ دین سمجھ سکو۔ عربوں کی زندگی کا پس منظر قرآن کریم میں موجود ہے۔ اور بہت سی اصلاحیں انھیں کے طریقِ زندگی اور انھیں کے مزاج کی اصلاحیں ہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ دین اسلام میں بہت سے عناصر عربوں کی اس وقت کی زندگی کی بدولت داخل ہوئے لیکن دینِ اسلام صرف عربوں کے لیے نہ تھا۔ وہ کافۃ الناس کے لیے تھا، اور اس کا نبی زمان و مکان کی قیود سے ماورا رحمۃ اللعالمین تھا۔ اسلام میں اساسی چیزیں عام آئینِ حیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور زندگی کے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ نہ عرب سے وابستہ ہے نہ عجم سے۔ عربوں کی نسلی اور قومی تقویت اسلام کا نصب العین نہ تھا۔ اگرچہ اسلام کے پہلے تلامذہ ہونے کی وجہ سے اُنھیں اولیت حاصل ہے۔ عرب سے باہر نکل کر اسلام ایسی ایسی اقوام میں پھیل گیا جن کا مزاج عربی مزاج سے بہت مختلف تھا۔ ایرانیوں اور عربوں کی ذہنیت میں بہت فرق تھا۔ ایرانی تہذیب و تمدّن عربی قبائلی تمدن سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ایک دین جب عالمگیر ہو جاتا ہے تو اس کی شکل و صورت افکار و تصورات جذبات و تاثرات ہر جگہ یکساں نہیں رہتے۔ اگر آج انگلستان والے مسلمان ہو جائیں تو ان کا اسلام

SALEEM LIBRARY
I/S Sher ... Gate,
Line Subhan ...

انگریزی اسلام ہوگا۔ اس پراگریزوں کی تاویلیں اور تعبیریں حبشیوں کے اسلام سے مختلف ہوں گی۔ اکثر لوگ یہ لکھتے ہیں کہ عجم میں آکر اسلام خالص نہ رہا بلکہ غیر اسلامی عناصر کی آمیزش سے خراب اور مسخ ہوگیا۔ لیکن یہ صداقت کا صرف ایک رُخ ہے۔ دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ عجمیوں نے اپنے مخصوص مزاج کی بدولت اسلام کی خدمت بھی کی ہے اور وہ اس انداز کی ہے جو عرب میں نہ ہوسکتی تھی۔ رومیؔ اور غزالیؔ اور ابن عربیؔ، عطارؔ اور سنائیؔ بلکہ یوں کہیے کہ اقبالؔ بھی عرب میں پیدا نہ ہوسکتے تھے۔ خاص افکار کے لیے خاص ماحول اور علوم و فنون و تہذیب و تمدن کے ایک خاص درجۂ ارتقا کی ضرورت ہوتی ہے۔ دین کے ازلی حقائق برقرار ہیں لیکن ان کی نئی نئی تشکیل کا مدار قومی مزاج پر ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی لکھا ہے کہ نبی کی تعلیم کے بعض عناصر قومی ہوتے ہیں اور بعض کل نوعِ انسان سے تعلق رکھتے ہیں غالبؔ کہتا ہے کہ عجمی نہاد ہونے کی وجہ سے دین اسلام کے عربی عناصر میرے دل و دماغ میں نہیں سماتے۔ اور اگر ان چیزوں کو بھی رموزِ دین قرار دیا جائے تو میں ان سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔ یہ بہت گہرا حکیمانہ شعر ہے۔ اندازِ بیان میں شوخی ہے لیکن وہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کوئی دین جب اپنی جنم بھوم سے نکل کر مختلف مزاج اور حالات کی قوموں میں پھیلتا ہے۔ تو اس کی ابتدائی تعلیم کے بہت سے عناصر جو قومی اور وقتی حیثیت رکھتے اور ایک خاص مزاج کی پیداوار ہوتے ہیں دیگر اقوام کے لیے یا ناقابلِ فہم ہوتے ہیں یا دلنشین نہیں ہوتے۔

تن پروریٔ خلق فزوں شد ز ریاضت
جز گرمیٔ افطار نہ دارد رمضاں ہیچ

صحیح عبادت اور ریاضت کا لازمی تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ تن کی پرورش کے بجائے من کی پرورش کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ لیکن عام تجربہ یہ ہے کہ مسجد کے ملّا اور شیوخ طریقت جو بڑے سرمایہ دار، زمیندار اور جاگیردار بن گئے ہیں بہت فربہ اور توندیل ہوتے ہیں۔ ان کی

SALEEM LIBRARY
I/S Sher ... Gate,
Line Subhan Khan Lahore.

عبادت اور ریاضت کی حقیقت اسی مٹاپے سے واضح ہوسکتی ہے۔ نبی اور ولی کا روزہ تو اصل روزہ ہوتا ہے۔ عام مہینوں کے مقابلے میں اس میں خوراک آدھی رہ جاتی ہے۔ نبی کریمؐ کے گھر میں اور مہینوں میں بھی کئی کئی روز چولھا نہ جلتا تھا اور قوتِ لایموت پر گزارہ رہتا تھا۔ غالبؔ کہتا ہے اب عبادت و ریاضت کا یہ حال ہے کہ عامیانِ خلق ہوں یا حامیانِ دینِ متین، ان کی ریاضت کا رُخ تن پروری کی طرف نظر آتا ہے۔ افطار کی تیاری کئی گھنٹے قبل شروع ہوتی ہے۔ میوہ جات جمع کیے جاتے ہیں۔ خوان سجائے جاتے ہیں، لذیذ چیزیں تلی جاتی ہیں تاکہ افطار کی ساعت پر دل بہلا رہے۔ اس کے بعد کھاتے پیتے لوگ اس خوانِ لذیذ پر بھوکے بھیڑیے کی طرح لپکتے ہیں۔ لیکن یہ محض افطاری ہوتی ہے۔ اصل کھانا اس کے بعد ہوگا جو خوب ڈٹ کر کھایا جائے گا۔ کیونکہ دن بھر کی بھوک کی تلافی کرنا ہے۔ اس کے بعد نصف شب سے پھر پکوان شروع ہوتا ہے۔ پراٹھے حلوے اور دیگر لذائذ سے پیٹ بھرا جاتا ہے۔ کیونکہ دس بارہ گھنٹوں تک کا فاقہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہے کہ عام مسلمان سوا ان غریبوں کے جنھیں نانِ شبینہ کی فکر رہتی ہے، اس مہینے میں دوسرے مہینوں کے مقابلے میں بہت زیادہ کھاتے ہیں۔ ہم نے بعض اصحاب سے یہ بھی سنا ہے کہ خدا جانے کیا وجہ ہے رمضان کے مہینے میں میرا وزن بڑھ گیا ہے۔ حکومت سے درخواست کی جاتی ہے کہ رمضان شریف آگیا شکر کا راشن بڑھا دیا جائے۔ گھی کی مقدار بھی دُگنی ہو جاتی ہے۔ غالبؔ نے اسی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے۔

غم چو بہم در افگند رہ کہ مراد می دہد   دانہ ذخیرہ می کند کاہ بباد می دہد
آخرِ منزلِ نخست نحوئے تو راہ می دہد   اولِ منزلِ دگہ بوسئے تو زاد می دہد
اے کہ بدیدہ غم زتست وے کہ بسینہ غم زتست   نازشِ غم کہ ہم زتست خاطرِ شاد می دہد

ان اشعار کا حوالہ فلسفۂ غم کے باب میں بھی ملے گا۔ اشعار ایسے دل افروز اور حیات انگیز ہیں کہ ان پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ خیر و شر کا مسئلہ دین اور حکمت کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔

خالقِ کائنات اگر خیرِ مطلق ہے اور قادرِ مطلق بھی تو یہ نقصان وحرمان کہاں سے آیا؟ خیر اور قدرت میں سے شر کیونکر پیدا ہوا۔ بہت سے کوتاہ بین شر کا وجود دیکھ کر خدائے رحیم کی ہستی کے منکر ہو جاتے ہیں۔ غالبؔ ان اشعار میں یہ گتھی سلجھا رہا ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد سیرت سازی ہے، بے خلل سلامتی سے کسی قسم کا ارتقا نہیں ہو سکتا۔ اگر شر کا وجود نہ ہو تو خیر بھی غائب ہو جائے، صبر سے روح میں تقویت اور بلند حوصلگی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر مصائب نہ ہوں تو صبر کی مشق کہاں سے آئے گی۔ زندگی کا آبِ حیات ظلماتِ آفات میں سے گزر کر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ مزاحمتوں پر غلبہ پانا اور اس غلبے سے نفس و روح کو قوی کرنا اس خودی کو استوار کرتا ہے جو آخر میں خدا کی ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ زندگی کی فصل میں کچھ دانے نکلتے ہیں اور کچھ گھاس پھوس۔ جھٹکنے اور پھٹکنے کے بغیر دانہ کاہ سے الگ کیونکر ہوگا؟ رنج و غم اسی تزلزل کا نام ہے۔ اگر اس کی حقیقت سمجھ لو تو تمھیں اس کا ادراک ہو جائے کہ یہ تمھاری زندگی کے نصب العین کی طرف جانے کا راستہ ہے۔ یہ سب کچھ تمھاری مراد پوری کرنے کے لیے ہو رہا ہے۔ وہ مراد سکون اور سلامتی نہیں بلکہ سیرت سازی ہے جو مزاحمت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ زندگی انسان کا امتحان کرتی ہے۔ جب آدمی صداقت کے راستوں پر چلنے لگتا ہے تو پہلی منزل کے آخر تک قہر و جلال ہی نظر آتا ہے۔ مالی اور مادی منافع ہاتھ سے نکل جاتے ہیں۔ نقصان مایہ بھی ہوتا ہے اور شماتتِ ہمسایہ بھی، خلقِ خدا بھی صداقت کیش کا ساتھ نہیں دیتی۔ لیکن اگر انسان صبر کے ساتھ اس منزل سے گزر جائے تو دوسری منزل کے شروع ہی میں مقصود سے قرب حاصل ہونا شروع ہوتا ہے۔ اور کامیابی کی خوشبو زادِ رہ بن جاتی ہے۔ دیدۂ پُرنم ہو یا دلِ پُرغم۔ یہ فطرت کا ایک ناز ہے۔ جب انسان اس حقیقت کو پا لے تو وہ شر اور نقصان کا شاکی نہ رہے گا اور اس کی غمگینی خاطر شاد میں تبدیل ہو جائے گی۔

دل اسبابِ طرب گم کردہ در بندِ غمِ ناں شُد
زراعت گاہِ دہقاں می شود چوں باغ ویراں شُد

کیا بلیغ مثال ہے۔ فنونِ لطیفہ ہوں یا طرب روحانی۔ عشقِ مجازی ہو یا عشقِ حقیقی۔ ان کے لیے فراغت اور فرصت درکار ہے۔ قحط پڑ جائے اور سدِ رمق کو قوتِ لایموت میسر نہ آئے تو یاراں فراموش کردند عشق کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانی زندگی کی ضرورتوں میں جسمانی اور مادی افادیت بھی ہے۔ اور ذوقِ جمال یا جمال آفرینی بھی زندگی کے حسن کی طرف وہی توجہ کر سکتا ہے جس کی بنیادی جسمانی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ بھوکا ثمر کی طرف لپکے گا، وہ حسنِ فطرت اور جمالِ گل و شگوفہ کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھے گا۔ بعض بھوکی قوموں کے وطن مناظرِ فطرت کی آغوش میں ہیں لیکن انھیں ان مناظر کے حسن و عظمت کا کوئی احساس نہیں۔ بھوک سے ذوقِ جمال غائب ہو جاتا ہے۔ جب ذوقِ جمال کے اسباب غائب ہو جائیں تو پھر انسان روٹی ہی کی فکر کرتا ہے۔ غالبؔ نے اس کی کیا اچھی مثال تلاش کی ہے۔ دہلی اور لاہور کے گرداگرد سیکڑوں تر و تازہ ثمر آور باغ تھے، جن کے گرد بلند دیواریں تھیں اور عالی شان دروازے تھے۔ اب ان تمام باغوں میں زراعت ہوتی ہے۔ قوم نے اسبابِ طرب کھو دیے تو باغ زراعت گاہِ دہقان بن گئے۔ اس شعر میں غالبؔ نے اپنی زندگی کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا پر یہی مثال صادق آتی ہے۔

زما گرم است ایں ہنگامہ بنگر شورِ ہستی را
قیامت می دمد از پردۂ خاکے کہ انساں شد

بہت گہرا اور لطیف مضمون ہے۔ اس میں شورِ ہستی سے مراد خارجی فطرت کی ہنگامہ خیزی نہیں بلکہ انسانی زندگی کی طوفان انگیزی ہے۔ عام عقیدہ یہ ہے کہ کسی وقت قیامت آئے گی۔ لاتعناہی قرون کے مُردوں کو حساب کتاب کے لیے اٹھایا جائے گا۔ اس

سے قبل زلزلے آئیں گے، پہاڑ پاش پاش ہو جائیں گے، آسمان پھٹ جائیں گے۔ کائنات کالعدم ہو جائے گی، محشر کی عدالت قائم ہوگی، کسی کو جزا ملے گی کسی کو سزا۔ کوئی جنت میں جائے گا کوئی دوزخ میں۔ کوئی گروہ ایک عرصے تک اعراف میں ٹھہرے گا۔ غالبؔ اس قیامت اور آخرت سے بحث نہیں کرتا۔ لیکن یہ کہتا ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قیامت خارج سے انسان پر وارد نہ ہوگی بلکہ وہ انسان کی ہمزاد ہے۔ انسان کی آفرینش اور قیامت کی آفرینش ہم زمان ہے۔ اس کی فطرت میں ہمیشہ زلزلہ رہتا ہے۔ جذبات کا طوفان، ہوس اور مقصودِ حیات کی کشمکش، آرزوؤں اور حسرتوں کا تلاطم۔ ایمان اور کفر کی آویزش، علم و جہل کی آمیزش یہ تمام محشر نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کے اعمال کا حساب بھی آئندہ نہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ ہو رہا ہے۔ میزانِ حیات میں اس کا ہر عمل تل رہا ہے۔ اور قول بھی ایسا صحیح کہ اس میں خیر و شر کے ذرّے بھی اپنا وزن بتاتے ہیں۔ آئندہ کائنات اور نوعِ انسان کا انجام کیا ہوگا اسے خدا کے سوا کون جانتا ہے لیکن یہاں جو مسلسل اور نقد قیامت ہے وہ چشمِ بصیرت کو نظر آتی ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ قیامت انسان کی باطنی کیفیّت کا نام ہے اور فطرتِ انسانی کا ایک لازمہ ہے۔

حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ سے کسی نے پوچھا کہ قیامت کیا ہے۔ جواب ملا کہ أنا یعنی نفسِ انسانی۔ پھر پوچھا کہ جنت اور دوزخ کیا ہیں؛ پھر وہی جواب دیا کہ أنا لوح و قلم کیا ہیں؛ فرمایا کہ أنا۔ قیامت کے متعلق عارف رومؔی نے بہت گہرے نکات پیش کیے ہیں ؎

پس قیامت شو قیامت را ببیں
دیدنِ ہر چیز را شرط است ایں

ہر چیز کے ادراک کی شرط یہی ہے کہ انسان وہ چیز ہو جائے بغیر عاشق ہونے کے عشق کی حقیقت کون جان سکتا۔ اور بغیر عالم ہونے کے علم کی لذّت سے کون

آشنا ہو سکتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اگر تو خود قیامت ہو جائے تو قیامت کی حقیقت تجھے معلوم ہو جائے۔ اس کے جاننے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ آسمانوں کا پھٹنا کیا ہوتا ہے اس کے معنی بھی تمہاری سمجھ میں آسکتے ہیں۔ بشرطیکہ فلک شگاف بصیرت پیدا کر لو۔

وَالسَّماءُ انْشَقَّتْ آخر از چہ بود
از یکے چشمے کہ ناگہ بر کشود

جنّت کی نسبت بھی عرفا نے لکھا ہے کہ وہ انسان کے اعمال کی ایک محسوس اور مثالی صورت ہوگی۔ قرآن کریم بھی کہتا ہے کہ جنّت کی مثال ایسی ہے گویا ایک باغ ہو جس میں نہریں جاری ہوں۔ دوزخ کی نسبت بھی قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ خارج سے اس کے شعلے انسان کو محیط نہ ہوں گے بلکہ یہ نار "تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَة" ہے۔ قلوب کے اندر سے اس کے شعلے نکلیں گے۔ غرض قیامت انسانی فطرت کی ہمزاد ہے۔ جس پردۂ خاک سے انسان پیدا ہوا اسی سے قیامت بھی نکلی۔ انسان کی زندگی ایک مسلسل محشر ہے۔

ہمچو رازے کہ بہ مستی ز دل آید بیروں
در بہاراں ہمہ بوئے ز صبا می آید

لطیف صوفیانہ ذوق کا شعر ہے اور حکمت سے لبریز ہے۔ محض شعریت کے لحاظ سے بھی بہت بلند پایہ ہے۔ ہستی سراپا استفہام ہے کہ اس کی کُنہ کیا ہے کیا یہ محض بے جان مادی ذرّات کی اتفاقی ترکیب کا کرشمہ ہے یا اس کی حرکت میں کوئی مقصد کوشی ہے۔ اس پردۂ زنگاری کے پیچھے کوئی محبوب ہے یا محض خلا ہی خلا ہے۔ فطرت کا حُسن اتفاقی ہے یا کوئی جمال آفریں اس کا خلّاق ہے جو خود بھی جمیل ہے اور جمال سے محبت رکھتا ہے۔ دین اس سوال کا جواب بحیثیت ایمان بالغیب پیش کرتا ہے اور حاضر کو اس کی شہادت میں لاتا ہے۔ استدلالی حکمت اس بارے میں دم بخود

اور سر بگریباں ہے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا   حافظ

فطرت اپنے رموز ہر کس و ناکس پر پوری طرح افشا نہیں کرتی۔ بقول اقبالؔ فطرت کو حفظِ اسرار کا سودا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی درست ہے کہ اسے ظہور کی تمنا بھی مضطرب رکھتی ہے۔ فطرت کا ایک پہلو مادہ اور حرکت کے آئین میں منکشف ہوتا ہے۔ اور اجرامِ فلکیہ کے ریاضیاتی اتفاق میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن بقول سر جیمز جینز عالم طبیعیات کا خدا ماہرِ ریاضیات ہی معلوم ہوتا ہے۔ فیثا غورس بھی ریاضی ہی کو خدا کہتے تھے۔ کیونکہ ریاضی ہر ساکن و متحرک چیز میں موجود ہے۔ اور موسیقی بھی ریاضی ہی کا کرشمہ ہے۔ سیاروں کی گردش سے نغمے نکلتے ہیں، کیونکہ ان کی حرکات میں ریاضیاتی تناسب اور توازن ہے۔ لیکن محض ریاضی سے انسان راضی نہیں ہوسکتا۔ مثلث اور دائرے کی ریاضیات کیسی ہی دل کش کیوں نہ ہوں روح کی پیاس نہیں بجھا سکتیں۔ اس میں انسانی زندگی کے اقدار اور اس کی تمنائیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ انسان کے لیے حسن و عشق سے زیادہ دلکش چیز کوئی نہیں ہوسکتی۔ وہ حسن و عشق کی تلاش میں غلطی بھی کرتا ہے۔ ٹھوکر بھی کھاتا ہے لیکن بہرحال مقصود غلط نہیں ہوتا۔ ذرائع اور وسائل میں دھوکا کھاتا ہے۔

موسمِ بہار حسن و عشق کا مظہر ہے۔ ویسے مٹی سے پوچھو تو رازِ حیات کے متعلق کیا خاک جواب دے گی لیکن ہر بوٹا ہر پتّا ہر شگوفہ، ہر ثمر، ہر لہلہاتا ہوا درخت ماہیتِ حیات کے سوال کا وہ جواب ہے جو کہیں اور سے نہیں مل سکتا۔ یہ فطرت کا الہام ہے۔ یہ وحی کی ایک قسم ہے۔ یہ مخلوق سے خالق کی ہم کلامی ہے۔ بہار سے سرور اور مستی وابستہ ہے۔ بہار میں انسان بے پیے مست ہوجاتا ہے۔ خود غالبؔ کہہ گیا ہے ؎

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر   بادہ نوشی ہے باد پیمائی

جب نشے میں کوئی شخص مست ہوجائے تو شعور پر سے وہ رکاوٹ ہٹ جاتی ہے جو انسان کو رازِ دروں کے اظہار سے روکتی ہے۔ ہوش مندی میں کوئی انسان اپنے راز دوسروں پر افشا نہیں کرتا۔ لیکن نشہ یہ پردہ آہنیں چاک کر دیتا ہے۔ اور انسان کے دل کی بات منہ سے بے اختیار نکل آتی ہے۔ غالبؔ کہتا ہے کہ بہار میں فطرت کا یہی حال ہوتا ہے۔ مستی میں وہ اپنا راز افشا کر دیتی ہے۔ اور وہ راز یہ ہے کہ میں خلّاقِ حسن ہوں۔ ہستی میں ذوقِ جمال کی مستی بھی ہے۔ اس کی خلاقی کوئی مقصد رکھتی ہے۔ کائنات کوئی اندھا کارخانہ نہیں۔ موجودات کے سارے آئین کا سرچشمہ یہی خلّاق حسن ہے۔ حسن سے عشق اور عشق سے حسن پیدا ہوتا ہے۔ حسن کی پروردگاری اور عشق کی پیغمبری پھولوں میں نظر آتی ہے۔

ایک حکیم نے لکھا ہے کہ کوئی باغبان مادہ پرست دہریہ نہیں ہوسکتا۔ مغرب کے مشہور صحافی اور ادیب بیورلے نکلز نے اپنے حالات میں لکھا ہے۔ میرے اندر یہ اضطراب پیدا ہوا کہ زندگی کی ماہیت دریافت کروں۔ تمام فلسفے چھان مارے تمام مذاہب کی کتابیں پڑھ ڈالیں کہیں تسلّی نہ ہوئی کہ اس کائنات کا مبدأ و منشا اور منتہا کیا ہے۔ اس کا کوئی مقصد بھی ہے یا نہیں۔ آخر مایوس ہو کر میں نے یہ سوال لاینحل سمجھ کر چھوڑ دیا اور باغبانی میں دل بہلانے لگا۔ جب موسمِ بہار آیا، شگوفے اور پھول نکلے۔ مردہ نما زمین نے ساحری اور اعجاز سے رنگ و بو کی ایک جنّت میرے سامنے رکھ دی تو یک بیک میرا سارا مسئلہ حل ہوگیا۔ شکوک رفع ہوگئے ہستی کی جمال آفرینی کا مجھے یقین ہوگیا۔ میں حسن و عشق کے خالق خدا کا قائل ہوگیا۔ فطرت نے اپنا راز مجھ پر افشا کر دیا۔ ایمان بالغیب یقین بالحاضر ہوگیا۔ سچ ہے کہ کوئی باغبان دہریہ نہیں ہوسکتا۔ ایک شاعر نے پھول کو خدا کا رسول کہا ہے اور کیا سچ کہا ہے۔ واہ کیا لطیف بات غالبؔ نے کہی ہے ؎

ہمچو رازے کہ بمستی ز دل آید بروں
در بہاراں ہمہ بوئیت ز صبا می آید

غالبؔ زندگی کے کسی حادثے کو شرِّ محض نہیں سمجھتا۔ اس کے کلام میں کثرت سے غم و اندوہ کے اشعار ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض ہم فلسفۂ غم کے عنوان کے تحت پیش کر چکے ہیں۔ اس کے کلام میں اس مضمون کی ایک مسلسل غزل ملتی ہے جس میں وہ یہ خیال ادا کرتا ہے کہ اس عالمِ تغیّر و مکافات میں قضا و قدر جب ایک کیفیّت کی نفی کرتی ہے تو بطور معاوضہ کسی دوسری اچھی چیز کا اثبات ہوتا ہے۔ اختلافِ لیل و نہار اس اصول کا ایک طبیعی مظاہرہ ہے۔ رات کتنی بھی تاریک ہو آخر اس کی سحر ہوتی ہے۔ شمعیں بجھ جاتی ہیں تو ان کی جگہ آفتاب عالم تاب کا ظہور ہوتا ہے جو لاتعداد کشتہ چراغوں کی تلافی کرتا ہے ؎

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

اس شعر کا مضمون ایک اور استاد کے مشہور شعر کے مماثل ہے جس کی تضمین بھی علّامہ اقبالؔ نے کی ہے اور فرمایا ہے کہ تب و تابِ ملّتِ بیضا کسی شاندار انقلاب کا پیش خیمہ ہے ؎

فغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

انگوروں کے فشار سے شراب بن جاتی ہے۔ ستارے گم ہوتے ہیں تو سورج نکل آتا ہے۔ ایک اردو نظم میں بھی اقبالؔ نے ستاروں اور سورج کا مضمون باندھا ہے ؎

شعلۂ خورشید شاید حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار

حکمت اور تصوّف کا ایک عام مضمون ہے کہ اسرار کی پردہ کشائی کے بعد حوصلۂ گفتار نہیں رہتا۔ معرفت کے بعد زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ کوئی معقول بات کہنے کے لیے وافر عقل و حکمت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے بعد جب زندگی کا پُراسرار ہونا حیرت آفریں ہوتا ہے تو انسان خاموش ہو جاتا ہے۔ یہ خاموشی کوئی سلبی کیفیت نہیں ہوتی بلکہ اس میں کمال درجے کا ایجاب ہوتا ہے۔

کاملے گفت است می باید بسے　　عقل و حکمت تا شود گویا کسے
باز باید عقل بے حد و شمار　　تا شود خاموش یک حکمت شعار

غالبؔ صاحب سخن ہے۔ تاثرات و افکار کی آفرینش اور ان کے بیان میں ایک نادرِ روزگار فن کار ہے لیکن اسے اس کا احساس ہے کہ زندگی کی حقیقت کے منکشف ہونے پر گفتار کا بہت سا حِصّہ بے کار ہو جاتا ہے۔ اگر گفتار کم ہو جائے اور حقیقت شناسی بڑھ جائے تو ایک چیز کے بجائے دوسرا نعم البدل مل جاتا ہے ؎

رُخ کشودند و لبِ ہرزہ سرایم بستند
دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

گفتار پر فکر کو ترجیح ہے اور فکر کا کمال نظر پر ختم ہوتا ہے۔ تذکروں میں ابوسعید ابوالخیر اور بوعلی سینا کی ایک ملاقات کا حال ملتا ہے۔ یہ بلند پایہ صاحب نظر صوفی اور حکمتِ مجسم بوعلی سینا ایک مرتبہ ہم مجلس ہوئے۔ بوعلی دیر تک الٰہیات میں فلسفیانہ گفتگو کرتا رہا۔ بوعلی از روئے عقل روحانیات کا قائل تھا لیکن اسے ان حقائق کا کوئی ذاتی تجربہ اور وجدان نہ تھا۔ بقول اقبالؔ ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

عقل کاخِ حقیقت کے آستانے تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے سامنے ایک پُر اسرار محل ہوتا ہے لیکن وہ اس میں داخل نہیں ہو سکتی۔ جب بوعلی تقریر ختم کر چکے تو ابوسعید

نے ایک مختصر جملے میں عقلی شعور اور وجدانی ظہور و حضور کا فرق بیان کر دیا۔ فرمایا کہ عقائق تو وہی ہیں لیکن صوفی اور استدلالی حکیم میں دانش و بینش کا فرق ہے۔ ارشاد کیا کہ "ہرچہ تو مے دانی من می بینم"۔ غالبؔ کہتا ہے کہ رُخ کشائی کے بعد لبِ زمزمہ بند ہو جائے تو کیا نقصان ہے۔ زبان بند ہوئی اور آنکھیں کھُل گئیں۔ دیدہ وری سخن وری سے بہتر ہے۔ اسلام کے بعد عجم کے آتشکدے ٹھنڈے ہو گئے۔ آج تک بعض عجمی عجم کی شاندار تہذیب کا ماتم کرتے ہیں جس پر تاریخ نے ظہورِ اسلام کے بعد خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ لیکن اس حقیقت کا منکر کون ہو سکتا ہے کہ اسلام قبول کرنے والے عجمیوں اور ان کی آنے والی نسلوں نے ایسا ادب پیدا کیا جس کے نمونے مجوسی ایران میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتے۔ عربی میں علوم و فنون کو ترقی دینے والے اکثر عجمی النسل ہیں۔ اور فارسی شاعری نے اسلامی دور کے اندر اس پرواز کا ثبوت دیا جو قبل اسلام کے ایران میں موجود نہ تھی۔ اسلامی عجمی تہذیب ہر لحاظ سے پہلی ایرانی تہذیبوں پر فائق ہو گئی۔ سنائیؔ، عطارؔ اور رومیؔ کیا اس تہذیب کا نعم البدل نہ تھے جو کوئی اعلیٰ درجے کا لٹریچر پیدا نہ کر سکی تھی۔ آتش کدے بجھے تو مسلمانوں میں نفسِ آتشیں نے افکار و اشعار میں گرمی پیدا کر دی۔ بت خانوں میں ناقوس کی آوازیں خاموش ہوئیں تو انسان گویا ہو گئے۔ تارِ نفس میں سے نغمہ نکلے یا نالہ بہر حال وہ ناقوس کی شورش سے افضل ہے ؎

سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند

شاہانِ عجم کے پاس لعل و جواہر کی بہت فراوانی تھی۔ ان کے تاج و تخت اور لباس میں بھی موتی جڑے تھے۔ اور ان کے فرش بھی جواہر سے مرصّع تھے۔ کسریٰ کا قالین جو اس کے خزانے کے ساتھ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں مدینہ منورہ لایا گیا۔ اس کے تار تار میں گراں بہا جواہر جڑے تھے۔ اس کے ٹکڑے جو مسلمان مجاہدین

میں تقسیم ہوئے۔ کرنسی نوٹوں کی طرح بازار میں سکّے کے طور پر خرید و فروخت میں استعمال کیے جاتے تھے۔ لیکن اچھّے افکار کے مقابلے میں ان قیمتی پتھروں کی کیا حقیقت ہے حکمت کے جواہر پارے کہیں زیادہ گراں بہا ہیں ؎

گہر از رایتِ شاہانِ عجم برچیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

ترکانِ پشنگی کا جاہ و جلال نہ رہا لیکن اس کے عوض میں میری پیشانی کو فرِّ کیانی عطا کیا گیا۔ موتی تاج میں سے تو اکھاڑ دیے گئے لیکن میری عقل میں جڑ دیے گئے۔ قضا و قدر نے ظاہری نمود میں سے جو کچھ کم کیا اس کی تلافی یہ کی کہ باطن میں جمال پیدا کیا ؎

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

فطرت کا یہ اصول افراد اور اقوام کی زندگی میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اسے قرآنِ حکیم نے بھی بیان کیا ہے کہ خدا کسی آیت (مظہرِ فطرت، حکمِ الٰہی یا شعارِ ملّت) کو منسوخ نہیں کرتا جب تک اس کے مماثل یا اس سے بہتر آیت معرضِ شہود میں نہیں آتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ظاہری نعمت کے ناپید ہی ہونے پر باطن میں تزکیہ اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ ظاہری نعمتوں کی کثرت روح کو خفتہ کر دیتی ہے اور اس کے ممکنات کو وجود پذیر نہیں ہونے دیتی۔ اگر ظاہری نقصان سے حکمت اور معرفت حاصل ہو جائے اور انسان زندگی کی سطحوں سے گزر کر اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرے تو یہ نقصان ہزار فائدوں کا ماخذ اور موجب بن سکتا ہے۔ ان اشعار سے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ اپنی ذات کا ذکر کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ انسانی زندگی اور انسانی تاریخ کا ایک کلّیہ بیان کر رہا ہے۔ کوئی نقصان ایسا نہیں جس میں سے ایک زندہ انسان اور ایک زندہ ملّت گراں بہا فوائد حاصل نہ کر سکے۔ انسانی زندگی حقیقت میں باطن کی زندگی

ہے۔ ہر حادثے کو اسی نظر سے دیکھنا چاہیے کہ باطن پر اس کا کیا اثر پڑا ہے جسمانی اور مادی نقصانات سیرت و کردار میں قوت اور بلندی پیدا کر سکتے ہیں۔ بقول اقبالؔ

ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں

ہاں اگر کسی نقصان سے انسان کی آنکھیں بھی نہ کھلیں تو اسے دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ کہہ سکتے ہیں۔

بہ عشق از دو جہاں بے نیاز باید بود — مجاز سوزِ حقیقت گداز باید بود
بجیبِ حوصلہ نقدِ نشاط باید ریخت — بجانِ شکوۂ تغافل طراز باید بود
چو لب نہ محرمِ سرایانِ شوق تواں شد — چو دل ز پردہ سرایانِ راز باید بود
چو بزمِ عشرتیاں تازہ رو تواں جوشید — چو شمعِ خلوتیاں جاں گداز باید بود
بہ صحنِ میکدہ سرمست می تواں گردید — بہ کنجِ صومعہ وقفِ نماز باید بود
نگہ زدیدۂ بیدار جو کہ سائل را — بہ گریہ طالبِ درہائے باز باید بود

چہ بر ز راحتِ آزادگی خوری غالبؔ
ترا کہ ایں ہمہ بار گ و ساز باید بود

'باید بود' کی ردیف ہی ایسی ہے کہ شاعر دل کھول کر ایسی تمنائیں بیان کر سکتا ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ غالبؔ کے ہاں تمناؤں کا ہجوم ملتا ہے۔ اسفل سے اعلیٰ تک کوئی ایسی تمنا نہیں جس کی لہریں اس کے دریائے دل میں نہ اٹھتی ہوں۔ غالبؔ کی طبیعت کا صحیح اور سچا نقشہ اس کے اس اردو شعر میں ملتا ہے کہ ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

وہ ہوس کا شکاری ہے اور عشق کا متوالا بھی۔ وہ گرفتارِ مجاز بھی ہے اور طالبِ حقیقت بھی،

وہ جلوت میں بزمِ عشرت کا متمنی ہے اور خلوت میں شمعِ عرفان سے نور حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ ثوابِ طاعت و زہد سے بھی واقف ہے اور دوسری طرف مئے مجاز ہو یا صہبائے حقیقت دونوں سے سرمست بھی رہنا چاہتا ہے۔ پہلے شعر میں کہتا ہے انسان کو چاہیے کہ عشق میں دونوں جہانوں سے بے نیاز ہو جائے۔ کوئی دنیا کا طالب ہے اور کوئی اجرِ آخرت کا متمنی لیکن کوئی جہان انسان کی منزلِ مقصود نہیں بن سکتا۔ مطلقاً بے نیازی تو ممکن نہیں کیونکہ ہر قدم پہ خود عشق ہی جمال آفرین بھی ہوتا ہے اور پرستارِ جمال بھی ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم — کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا ست

لیکن زندگی ذوقِ سفر ہے اور یہ سفر لامتناہی ہے۔ اس کی منزل کبریا ہے جہاں وہ کبھی پہنچ نہیں سکتا۔ اگرچہ شوقِ قرب اس کی ہستی کو بلند کرتا چلا جاتا ہے۔ ہر جہان میں اسے ایک پہلو مجاز کا نظر آتا ہے اور ایک حقیقت کا، لیکن آگے بڑھتے ہوئے وہ حقیقت بھی مجاز بن جاتی ہے۔ حقیقت بھی ایک اضافی چیز ہے۔ کسی مجاز کے مقابلے میں وہ حقیقت ہے لیکن کسی بلند تر حقیقت کے مقابلے میں وہ حقیقت خود مجاز رہ جاتی ہے جس پر سے گزر جانا لازمی ہے عشق کو غالبؔ بھی رومیؔ اور اقبالؔ کی طرح نہایت وسیع اور گہرے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ یہ عشق حیاتِ لامحدود کی تمنا ہے ؎

ہر لحظہ نیا طور نیا ذوقِ تجلی — اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے — اقبالؔ

غالبؔ نے اس شعر میں نہایت گہری بات کہی ہے۔ مجاز سوزی اور حقیقت طلبی کی تعلیم تو حکمت اور تصوف میں ہر جگہ ملتی ہے لیکن وہ کہتا ہے کہ ذوقِ ارتقا میں انسان کو نہ صرف مجاز سوز ہونا چاہیے بلکہ حقیقت گداز ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ جس چیز کو انسان حقیقت سمجھ لیتا ہے وہ بھی حضور نہیں بلکہ غیاب ہی ہے ؎

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

خیامؔ کی ایک رباعی ہے جو نہایت شوخ گستاخانہ ادا کا فرانہ انداز کی ہے جسے بادی النظر

SALEEM LIBRARY
1/3 Sheranwala Gate,
Kine Subhan Khan Lahore.

میں شطحیات میں شمار کر سکتے ہیں لیکن اگر اس کی تہ کو پہنچیں تو اس میں بھی یہی مضمون مضمر ہے کہ کفر اور اسلام دونوں کے ظواہر ایسے ہیں جن کے اندر ٹھہر جانا اور انھیں منزل سمجھ لینا ابدکوش انسان کے لیے پست ہمتی ہے۔ ہر فکر اور ہر کیفیت کو عبوری کیفیت سمجھنا چاہیے۔ رباعی یہ ہے ؎

رندے دیدم نشستہ بر پشتۂ زمیں — نے کفر نہ اسلام نہ دنیا نہ دیں
نے حق نہ حقیقت نہ شریعت نہ یقیں — در ہر دو جہاں کرا بود زہرۂ ایں

کہتا ہے کہ دونوں جہانوں میں بھلا یہ حوصلہ کسے ہو سکتا ہے۔ تصوف میں اکثر نشاط سے گریز کی تلقین کی جاتی ہے، کیونکہ نشاط طلبی میں انسان تمام بلند مقاصد کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ غالب کہتا ہے کہ یہ ایک متضاد نما بات ہے کہ نشاط کی طلب بھی ہو اور نشاط سے تغافل بھی لیکن نصب العین یہی ہے کہ نشاط کے ساتھ اس سے تغافل کی صلاحیت بھی باقی رہے۔ صوفیہ نے کہا ہے قلزمِ حیات میں بطخ کی طرح تیرنا چاہیے۔ کہ مسلسل پانی میں رہتے ہوئے بھی پر نہ بھیگیں۔ اس تضاد میں وحدت پیدا کرنا کس قدر مشکل ہے۔ لیکن زندگی کا مقصد ہی اس کا تضاد رفع کرنا ہے۔

؎ بجیبِ حوصلہ نقدِ نشاط باید ریخت
بجاں شکوہِ تغافل طراز باید بود

آگے چل کر کہتا ہے کہ مکمل انسان وہ ہے جو روحانیت کو زہد خشک کے مرادف نہ سمجھ لے۔ جو مذہب افسردگی سکھائے اس میں کچھ خلل ہے۔ شمع جانگداز ہونے کے باوجود تازہ رو اور منور ہوتی ہے۔ اپنے گداز سے وہ دیدۂ اغیار کو بھی بینا کرتی ہے۔ اگر زندگی میں صحیح توازن پیدا ہو جائے تو یہ کیفیت ہو گی کہ جاں گدازی تازہ روئی کو مانع نہ ہو گی ؎

چو بزمِ عشرتیاں تازہ رو تواں جوشید
چو شمعِ خلوتیاں جاں گداز باید بود

چاہیے کہ انسان صحنِ میکدہ میں سرمست بھی ہو اور کنجِ صومعہ میں وقفِ نماز بھی۔ ظاہری عبادت باطنی سرمستی سے ہم آغوش ہونی چاہیے۔

؎ بہ صحنِ میکدہ سرمست می تواں گردید
بہ کنجِ صومعہ وقفِ نماز باید بود

حافظ کا یہ شعر اسی مضمون کا ہے ؎

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

اسی غزل کے ایک اور شعر میں کہتا ہے ضرورت اس کی ہے کہ انسان زندگی کے متعلق صحیح نظر پیدا کرے۔ یہ صحیح نظر اہلِ نظر کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔ نظر کے لیے لازم ہے کہ دیدۂ ظاہر اور چشمِ باطن دونوں بیدار ہوں۔ کیا عمدہ تمثیل ہے کہ گدا اگر بند دروازوں کے آگے کھڑا ہو کر بھیک نہیں مانگتا۔ گدیۂ نظر بھی در ہائے باز ہی سے ہونا چاہیے۔ حضرت نقشبند علیہ الرحمۃ کے یہ دو شعر کس قدر بصیرت آفریں ہیں ؎

تا کے بہ زیارتِ مقابر — عمرے گذرانی اے فسردہ
یک گریۂ زندہ پیشِ عارف — بہتر ز ہزار شیرِ مُردہ

چشمِ بیدار کے متعلق اقبال نے بھی خوب کہا ہے ؎

کافرِ بیدار دل پیشِ صنم
بہ ز دیندارے کہ خفتہ در حرم

خفتہ دیندار سے تو کافرِ بیدار ہی اچھا ہے۔ یہ بیداری شاید اسے صنم پرستی سے آگے لے جائے۔ لیکن خفتہ دیندار تو کسی منزل کا راہی نہیں۔ چلنے والے اور بھٹکنے والے مسافر بھی شاید کبھی منزل پر پہنچ جائیں۔ خفتہ باطن شخص تو یہیں کا یہیں رہ جائے گا۔

مقطع میں غالب کو خود یہ شک پیدا ہوا ہے کہ یہ متضاد قسم کی خواہشیں جن کے پورا کرنے کے لیے ساز و سامان کی ضرورت ہے۔ وہ آزادگی کہاں سے پیدا کریں گی جس کی تمنا روح کو ہے۔ فکرِ برگ و ساز انسان کو پابزنجیر اور پاگل کرتی رہے گی۔

ہر قدم پر وہ تمناؤں میں اُلجھا رہے گا ؎

چہ بر زراحتِ آزادگی خوری غالبؔ
ترا کہ ایں ہمہ با برگ و ساز باید بود

بلند عشق اور ادنیٰ جذبات بیک وقت ایک ہی طبیعت میں موجود ہونا انسان کے لیے کتنی شدید کشاکش کا باعث ہوتا ہے۔ اردو میں غالبؔ کا یہ شعر اس کی اندرونی پیکار کا بیان ہے ؎

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

برآر از بزمِ بحث اے جذبۂ توحید غالبؔ را
کہ ترکِ سادۂ ما با فقیہاں بر نمے آید

توحید مست عارف کبھی فقیہوں کی سمجھ میں نہیں آئے۔ جب فقہا نے انھیں ملحد کہنا شروع کیا تو انھوں نے خود اپنے لیے کافر کی ملامتی اصطلاح معین کر لی اور خسروؔ کی طرح پکارنا شروع کیا کہ (ع) کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست

حضرت نظام الدینؒ دلی کا محبوب اور خلیفہ بھلا حقیقی اسلام کو کہاں ترک کر سکتا تھا لیکن فقیہوں نے لایعنی فروعی بحثوں اور عبادات میں ظواہر کے جھگڑوں کو دین سمجھ لیا تھا۔ انھیں جھگڑوں نے ملتِ بیضا کو ہفتاد و دو ملت میں تقسیم اور منتشر کر دیا تھا۔ حافظ علیہ الرحمۃ بھی بیزار ہو کر فرماتے ہیں ؎

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد وائے گر در پسِ امروز بود فردائے

علامہ اقبالؔ بھی فروعات کی اس جنگ سے بیزار ہو کر فقیہوں کے متعلق بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ (ع) دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد۔ اور فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

ایک طرف حکیم اور ملا اور دوسری طرف صوفی اور ملا کی آویزش اسلامی عالمِ فکر و عمل میں ایک پیکارِ قدیم ہے۔ امام غزالیؒ جو فقیہ ہونے کے علاوہ حکیم اور صوفی بھی تھے، اپنے زمانے کے فقہا سے سخت ناراض تھے۔ فقہ میں اُلجھ کر مناظرہ بازی کرنے والوں کو انھوں نے بھی دین کی حقیقت سے ناآشنا سمجھا۔ فیضیؔ نے ایک پوری غزل کسی قدر تلخ انداز میں ایسے فقہا کے متعلق لکھی ہے۔ فروعی فرائض کے جھگڑوں کے متعلق کہتا ہے کہ خدا نہ کرے کوئی انھیں پڑھے۔ یہ مُردہ شو ملا کا مشغلہ ہے ؎

مشاجراتِ فرائض کہ کس مخوانادش
زمن مجوے کہ ایں علم مردہ شویان است

حکیم کی نظر اصول تلاش کرتی ہے اور وہ اصل و فرع میں تمیز کر سکتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ فروع میں بہت سی تخفیف اور توسیع کی گنجائش ہے۔ اور فروع پر جھگڑنے والا اصلیت کو ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے۔ دوسری طرف موحد انسانوں کی زندگی میں وحدت اور مودت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مقصود فصل نہیں بلکہ وصل ہوتا ہے۔ رسوم و شعائر کو وہ ثانوی چیز سمجھتا ہے۔ اور اس کا قائل ہوتا ہے کہ اختلافِ شعائر کے باوجود انسانوں کے اندر ایک بنیادی وحدت ہے۔ خود غالبؔ ہی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

جو صوفیہ توحید سے سرمست ہوتے ہیں ان میں بڑی رواداری ہوتی ہے۔ مسلم اور غیر مسلم بلا امتیاز مذہب و ملت ان کے فیضان سے سرشار ہوتے ہیں۔ وہ نہ تو فروعی اختلاف کے باعث لوگوں سے جھگڑتے ہیں اور نہ ان سے متنفر ہی ہوتے ہیں۔ وہ فقہی مسائل میں کسی سے مناظرہ بھی نہیں کرتے۔ امام غزالی علیہ الرحمۃ میں جب توحید کا جذبہ بیدار ہوا تو انھوں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی کسی سے مناظرہ نہ کروں گا۔ وہ ان نفسیات کو اچھی طرح جانتے

SALEEM LIBRARY
1/S Sheranwala Gate,
Line Subhan Khan Lahore.

ہیں کہ بحث وجدل سے کسی انسان کو قائل نہیں کر سکتے۔ اور استدلال ہیں مغلوب ہو کر کسی شخص میں ایمان پیدا نہیں ہوتا۔ ایمان اور ہی راستوں سے آتا ہے۔ فقیہوں نے فروعی مباحث میں بہت دفعہ تاریخِ اسلام میں کشت وخون تک نوبت پہنچائی ہے۔ غالبؔ خدا سے دعا کرتا ہے کہ جذبۂ توحید اسے اس بحث وجدل سے باہر لے آئے۔ اور کہتا ہے کہ مجھ ایسا سادہ تُرک ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ جذبۂ توحید کے بیدار ہونے کے بعد تمام مسائلِ حیات کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ زندگی شاخوں میں اُلجھنے کے بجائے بیخ وبن سے سیراب ہونے لگتی ہے۔ ایسا فقیہ کہیں ڈھونڈے ہی سے ملے گا۔ جو فقیہ ہونے کے ساتھ موحد جیسی وسعتِ قلب بھی رکھتا ہو۔

ایک ادعا اور پندار ہے جو انسان کو کفر ودین کی بعض لاطائل بحثوں میں مبتلا رکھتا ہے۔ مسلمان کا فرض یہ تھا کہ اپنی خوش فکری اور حسنِ سیرت کا نمونہ پیش کر کے دوسروں کو اسلام کی نعمت میں شریک ہونے کی رغبت دلائے۔ لیکن فقہا نے اس کے برعکس یہ رویّہ اختیار کر لیا کہ کفر اور دین کی مصنوعی اور من مانی تعیین کر کے خود مسلمانوں کی تکفیر شروع کر دی۔ جو لوگ مسلمان پیدا ہوئے تھے اور کلمہ گو تھے اُنھیں بھی اسلام سے خارج کر دیا۔ غالبؔ اس حرکت کو آلائشِ پندارِ وجود کہتا ہے۔ اور یہ تلقین کرتا ہے کہ اگر تو اس پندار سے پاک ہو جائے۔ تو باوجود اس کے کہ بظاہر تیرے قول وفعل میں کسی کو کفر بھی دکھائی دے۔ لیکن دین کی اصلیت تجھ میں باقی رہے گی۔ اصل چیز تزکیۂ نفس ہے ؎

کفر ودیں چیست جُز آلائشِ پندارِ وجود
پاک شو پاک کہ ہم کفرِ تو دینِ تو شود

ایسے ہی انسان کے متعلق مولانا رومؒ فرما گئے ہیں کہ

"گر بگوید کفر آید بوئے دیں"

ZAKAULLAH MEMORIAL LIBRARY

پیچ وخم دستگاہ کرد فزوں حرصِ جاہ
ریشہ چو آمد بروں دانۂ ما دام شد

یہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ زندگی کے کسی شعبے میں جیسے جیسے اس کی استعداد ترقی کرتی ہے ویسے ویسے جذبۂ اقتدار بھی ترقی کرتا ہے۔ حرصِ جاہ علم وفن ہی کی آفت نہیں دینی اور روحانی زندگی میں بھی کم ہی نفوس ایسے ملتے ہیں جن میں ترقی کے ساتھ عجب وپندار پیدا نہ ہو۔ حصولِ کمال سے لوگ صاحبِ کمال کی عزت کرنے لگتے ہیں۔ وہ ہر طرف سے اپنی تعریف سنتا ہے۔ اب وہ ہر ایک سے مدح وستائش کی توقع کرنے لگتا ہے۔ کمال کسی قسم کا ہو صاحبِ کمال کو اس کی بدولت تھوڑا بہت اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ جذبۂ اقتدار تحکم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ انسان مخالفانہ تنقید برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنی قوتوں کے متعلق اسے مغالطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ علم کے ساتھ حلم بھی پایا جائے۔ تھوڑی سی عبادت اور تزکیۂ نفس کے ساتھ پندارِ زہد پیدا ہوتا ہے، زاہد کو گنہگاروں پر اپنے تفوق کا احساس ہوتا ہے وہ خواہشمند ہوتا ہے کہ عوام اپنے آپ کو اس سے کمتر سمجھیں۔ اسی ذوقِ اقتدار میں کم ظرف لوگ پیر بن بیٹھتے ہیں۔ مریدوں کا حلقہ وسیع ہونا شروع ہوتا ہے۔ کچھ پیر صاحب کی پرواز ہوتی ہے اور اس سے زیادہ مُریدان مے پرانند، سے سجادہ مستحکم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پیر اور مرید میں آقا اور غلام کی نسبت قائم ہو جاتی ہے۔ پھر پیر صاحب حالات ومقامات میں اپنے نزدیک ترقی کرتے ہوئے بڑے بڑے دعوے کرنے لگتے ہیں۔ نفس کے دعووں سے نبوت اور الوہیت سے ڈانڈے مل جاتے ہیں عالم

علم کے ذریعے سے جاہ و مال حاصل کرنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ "لنگڑی تلے سے عرفی و قدسی نکل چلے" میدانِ سیاست میں ترقی اور عوام سے خراجِ تحسین وصول کرتے ہوئے نفس پر آمریت کا بھوت سوار ہوتا ہے۔ خال خال ہی مردانِ خدا ایسے ہوتے ہیں۔ جو کسی قسم کی ترقی کے بعد حرصِ جاہ سے بچ سکیں۔ قسم قسم کے کمالات شہرت طلبی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں اور یہ شہرت طلبی اصل میں پنہاں جاہ طلبی ہوتی ہے۔ مولانا رُوم فرماتے ہیں کہ خلق میں مشہور ہونا انسان کے نفس کو طوق اور زنجیریں پہنا دیتا ہے ؎

اشتہارِ خلق بندِ محکم است

اس کیفیت کے لیے غالبؔ نے ایک نادر تمثیل پیدا کی ہے۔ کہتا ہے کشتِ حیات میں نفس کے اندر جو دانے بوئے جاتے ہیں۔ وہ اپنے نشو و نما میں بعض اوقات ایسے پیچ در پیچ ریشے نکالتے ہیں۔ کہ معلوم ہوتا ہے دانہ خود اپنے پیدا کردہ ریشوں کے جال میں اٹکا ہے۔ کسی چیز میں کوئی دستگاہ حاصل ہوئی تو اس کے ساتھ نفس کی پیچیدگیوں نے جال بُننا شروع کر دیا جس کے اندر نفس خود پا بزنجیر ہو گیا۔ امرسن نے ایک نہایت حکیمانہ نصیحت کی ہے۔ کہ اپنے اعمال پر کڑی نگرانی رکھو کیونکہ وہ تسلسل سے تمھیں سلاسل پہنا دیں گے اور جکڑتے جائیں گے اقبالؔ کا یہ شعر بھی تقریباً اسی مضمون کا ہے

؎ دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موج مضطر ہی اُسے زنجیرِ پا ہو جائیگی

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد
زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد

کونسا شخص ہے جس میں کم و بیش ذوقِ سفر نہ ہو۔ جو شخص گھر کی چار دیواری اور وطن کے حدود سے باہر نہیں نکلتا۔ کنوئیں کے مینڈک کی طرح زندگی کے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ محدود ہوتا ہے۔ اختلافِ السنہ و ملل آب و ہوا کا تنوع تہذیبوں اور تمدنوں کی گوناگونی، مختلف قسم کے انسانوں سے واسطہ نفسِ انسانی میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتا ہے۔ طبیعت میں کچھ رواداری پیدا ہوتی ہے۔ فریضہ حج میں اور بہت سے منافع ہیں لیکن ایک بڑی منفعت یہ ہے کہ دور دراز مسافتوں سے مسلمانوں کو سفر کر کے اسلام کے ظاہری مرکز یعنی کعبے تک پہنچنا ہے۔ قرآن کریم میں "سیروا فی الارض" بصیرت افروزی کے لیے ایک عام ہدایت ہے۔ اس سے قوموں کے عروج و زوال کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ تقابلی مطالعے سے قسم قسم کے حقائق منکشف ہوتے ہیں۔ حسد، بغض اور تنگ نظری کا علاج ہوتا ہے اُردو کلام میں بھی غالبؔ نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کثرتِ تماشائے حیات سے انسان کو بصیرت حاصل ہوتی اور تنگ نظری سے نجات ملتی ہے۔ ؎

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

غالبؔ کہتا ہے کہ سفر میں "می نگریم و می رویم" یا دیکھتا چلا گیا بہت دلچسپ ہو۔ اگر اس میں یہ بات نہ ہو کہ بعض چیزیں دل میں کھُب جاتی ہیں بعض انسان بہت دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ بعض مقامات ایسے ہوتے

ہیں کہ طبیعی یا روحانی فیوض کی وجہ سے انسان چاہتا ہے وہیں رہ جائے لیکن ان سب سے گزر جانا پڑتا اور دل بہت سی حسرتوں سے بھر جاتا ہے یہ خلل کا پہلو نہ ہو تو کیا کہنے ہیں اس روانیٔ عمر کے جو سفر میں گزرے۔ اسی غزل کے دُوسرے شعر میں اندازہ و اعتدال کی نصیحت کرتا ہے کہ زندگی میں غرقِ حصولِ تمنّا ہونے سے بھی بچنا چاہیے۔ مثال بہت اچھی دی ہے کہ پیاسا پانی کا طالب ہوتا ہے ۔ اگر پانی اتنا ہو کہ اسے غرق کر دے تو حیات کا طالب حدت کی لپیٹ میں آجائے گا

؎ بوصل لطف باندازۂ تحمل کن!

کہ مرگِ تشنہ بود آب چوں ز سر گزرد

'آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند' کا مصرع غالب نے ایک ہی غزل میں دو جگہ باندھا ہے۔ پہلا شعر تو شراب نوشی کے متعلق ہے جسے ہم پہلے بھی درج کر چکے ہیں۔ جس میں کہتا ہے یہ حکم کہ شراب ہر حالت میں ہر شخص کے لیے کلیتہً حرام ہے۔ ایک دروغ مصلحت آمیز ہے۔ اعتدال سے پینے والے اہلِ خرد کو تو انفرادی طور پر اس سے کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن قانون اکثریت کو مدِّ نظر رکھ کر بنتا ہے اس لحاظ سے بے شک اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہوتا ہے۔ دنیا میں عقلمند کم ہیں اور احمق زیادہ۔ قانون انسانوں کی عام حماقت مدّ نظر رکھ کر بنایا جاتا ہے

؎ از مے ترا ہر آئنہ پرہیز گفتہ اند!

آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند

اس غزل کے مقطع میں کہتا ہے اے غالب دہر کے غیر مسلم تجھے

مُسلمان سمجھتے ہیں حالانکہ نہ تجھ میں کوئی مسلمانی کی بات ہے نہ تو اپنے آپ کو مسلمان کہہ سکتا ہے اور نہ مومن پارسا تجھ ایسے رند شرابی کو مسلمانوں کے زمرے میں شمار کرے گا۔ تجھ سے شخص کو مسلمان کہنا بھی ایک دروغ مصلحت آمیز ہے۔ عمر بھر نماز نہ پڑھے اور روز شراب پیئے بھلا تو کہاں کا مسلمان ہے۔ ایک خط میں مرزا نے لکھا ہے، میں اپنے آپ پر تعجب کرتا ہوں کہ میری زندگی میں اسلام کی کوئی بات نہیں اس کے باوجود مسلمانوں کی ذلت اور تباہی سے میرے دل پر چوٹ لگتی ہے حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کا دل مسلمانوں کی عزت و ذلت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے وہ اسلام سے مطلقاً بیگانہ تو نہیں ہو سکتا۔ اقبال بھی اپنی نسبت کہتا ہے ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا!

اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلماں ہوں میں

اپنی مسلمانی کے متعلق غالب کا یہ لطیفہ بھی لطف آفرین ہے جب غدر کے بعد انگریز فوجی مجسٹریٹ کے پوچھنے پر کہ وَل تم مسلمان ہو؟ غالب نے یہ جواب دیا کہ حضور آدھا۔ مجسٹریٹ نے سوال کیا کہ آدھا مسلمان کیسے ہوتا ہے۔ اس کی توضیح میں غالب نے کہا کہ شراب پی لیتا ہوں مگر سؤر نہیں کھاتا۔ مقطع میں غالب کہتا ہے کہ اگر حقیقت دیکھو تو مجھ ایسے شخص کو مسلمان نہ کہنا چاہیے۔ لیکن ملت کی تقسیم کے لحاظ سے غیر مسلم مجھے مُسلمان سمجھتے ہیں۔ دراصل یہ جھوٹی بات ہے خواہ یہ کہنا کسی مصلحت ہی پر مبنی ہو ؎

غالب ترا بدیر مسلماں شمردہ اند   آرے دروغ مصلحت آمیز گفتہ اند